اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

(۳)

(مترجمہ مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی)

اہل الرائے ان لوگوں کے مقابلہ میں (جن کا ذکر اوپر گذرا اور جن کو اہل الحدیث کہا جاتا ہے) ایک دوسرا گروہ ہے جس کا تعلق امام مالک اور سفیان ثوری کے عہد، اور اس کے بعد کے زمانوں سے ہے۔ یہ لوگ نہ (فرضی) مسائل پر سوال وجواب کو برا سمجھتے تھے نہ فتوی دینے میں کوئی ڈر (اور جھجکاہٹ) محسوس کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ فقہ ہی پر دین کی بنیاد ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کو وسیع پیمانہ پر لوگوں تک پہنچایا جائے۔ لیکن حدیثیں بیان کرنے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے سے بہت ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ امام شعبی نے صاف اور صریح لفظوں میں فرمایا:

"کسی حدیث کا (بجائے رسول اللہ کے) صحابہؓ تک پہنچ کر رہ جانا ہمیں زیادہ پسند ہے، تاکہ اگر اس کے الفاظ میں کوئی کمی بیشی ہو گئی ہو تو وہ دوسروں ہی کی طرف منسوب ہو کر رہ جائے (اور ذات نبوی کی طرف اس کی نسبت کے گناہ سے انسان بچ جائے)"

ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ:

"مجھ کو (احادیث رسول سنانے کے بجائے) یہ کہنا زیادہ پسند ہے کہ عبداللہ ابن مسعود نے یہ فرمایا ہے، علقمہ نے یہ کہا ہے۔"

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ جب رسول اللہ صلعم کی کوئی حدیث بیان کرتے تھے تو ان کا چہرہ (ذات حدیث کی بھاری ذمہ داریوں کی ہیبت سے) متغیر ہو جاتا اور (سہم سہم کر) فرماتے:

"رسول اکرم صلعم نے) ایسا ہی (فرمایا ہے) یا اسی کے قریب قریب۔ ایسا ہی (فرمایا) یا اسی کے قریب قریب۔"

حضرت عمرؓ نے جب انصار کا ایک وفد کوفہ بھیجا تو انھیں ہدایت کی کہ:

"تم کوفہ جا رہے ہو، جہاں تم ایسے (باخدا) لوگوں سے ملو گے جو قرآن پڑھ کر رو پڑتے ہیں، یہ لوگ تمھارے پاس آ کر کہیں گے کہ محمد (رسول اللہ صلعم) کے ساتھی آئے! محمدؐ کے ساتھی آئے! غرض وہ تمھارے پاس آ کر تم سے حدیثیں سننا چاہیں گے تو تم حتی الوسع کم سے کم حدیثیں بیان کرنا۔"

ابن عون فرماتے ہیں کہ جب امام شعبی کے پاس کوئی مسئلہ آتا تو وہ اس کا جواب دینے سے پہلو تہی کرتے۔ ان کے بالمقابل ابراہیم نخعی کا دستور یہ تھا کہ سائل کا جواب دینے میں ان کی زبان خاموش ہونا جانتی ہی نہ تھی ــــ ان تمام آثار کو امام دارمی نے نقل کیا ہے۔

ظہور تخریج کے اسباب (اس اختلاف نظر کی وجہ سے) حدیث اور فقہ اور مسائل کی تدوین، (جو پہلے لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پا چکی تھی) ان لوگوں کے جس طرح کام آئی اس کی نوعیت علمائے حدیث کے طریق استفادہ سے جداگانہ تھی، جس کی وجہ اور جس کی تفصیل یہ ہے کہ ان کے پاس احادیث و آثار کا وہ ذخیرہ عظیم نہ تھا جس کے ذریعہ اہل الحدیث کے اختیار کیے ہوئے اصول پر مسائل فقہیہ کا استنباط کر سکتے۔ نیز یہ کہ ان کے سینے اس بات کے لیے کھل نہ سکے تھے کہ (مختلف الخیال) علمائے سلف کے اقوال کو گہری نگاہ سے دیکھتے، ان کو جمع کرتے، ان پر بحث کرتے (بلکہ اس کے برعکس) انھوں نے اس بارے میں وہ طریقہ اختیار کیا جس سے اتہامات کا ہدف بن گئے اور (تمام اہل علم کو ان کے اپنے صحیح موقف پر رکھ کر ان کے اقوال پر غیر جانبدارانہ نظر تحقیق و تنقید ڈالنے کے بجائے) انھوں نے صرف اپنے ائمہ کو لے لیا اور ان کے متعلق دلوں میں یہ نقش عقیدت بٹھا لیا کہ انھیں تحقیق کا بلند ترین مقام حاصل تھا (مختصر یہ کہ) ان لوگوں کے دل اپنے شیوخ کی طرف انتہائی حد تک جھک گئے تھے، چنانچہ علقمہ نے کھلے بندوں فرمایا:

"کیا کوئی صحابی عبداللہ بن مسعود سے زیادہ پختہ نظر رکھتا ہے۔"

امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ:

"ابراہیم سالم سے زیادہ فقیہ ہیں اور اگر صحبت رسول کی فضیلت کا سوال نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ علقمہ (تابعی) ابن عمر (صحابی) سے بڑے فقیہ ہیں۔"

(پھر تیسری چیز یہ کہ) ان لوگوں کو قدرت کی طرف سے ایسی ذہانت اور زود فہمی عطا ہوئی تھی اور ان کا ذہن ایک بات سے دوسری بات کی طرف بسرعت منتقل ہونے کا اتنا ملکہ رکھتا تھا کہ وہ اپنے شیوخ کے اقوال پر جواب مسئلہ کی بآسانی "تخریج" کر سکتے تھے ---- اور حق یہ ہے کہ جس کام کے لیے جو پیدا کیا گیا ہے اس کے لیے اسی کام کی راہ آسان بھی کی جاتی ہے، اور ہر گروہ اپنے ہی سرمایۂ فکر و نظر میں مگن رہتا ہے ---- الغرض یہ اسباب تھے جن کی بنا پر ان حضرات نے تخریج کو اپنی فقہ کی عمارت کا سنگ بنیاد قرار دے لیا۔

تخریج کا قاعدہ تخریج کا قاعدہ یہ ہے کہ آدمی اس صاحب علم کی کتاب اپنے حافظہ میں منتقل کرلے جو اس کے شیوخ و اساتذہ کی بہترین وکالت کرتا ہو اور علمائے جماعت کے اقوال سے سب سے زیادہ واقفیت رکھتا ہو اور (مختلف اقوال میں سے ایک کو دوسرے پر) ترجیح دینے میں سب سے بڑھکر فکر صائب رکھنے والا ہو۔ پھر (اس طرح کی کتاب حفظ کر لینے کے بعد) ہر مسئلہ میں حکم کی علت پر غور کرے، اور جب کوئی بات اس سے پوچھی جائے، یا خود ہی کو کسی امر میں حکم شریعت معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اپنے شیوخ کی تصریحات کے اس ذخیرہ پر، جس کو اس نے اپنے حافظہ میں محفوظ کر رکھا ہے، نگاہ ڈالے، اگر اس سے مسئلہ کا جواب صریح طور پہ مل جائے تو خیر، ورنہ شیوخ کے ان اقوال صریحہ کے عموم کو دیکھے اور اس عموم کو اس مسئلہ پیش آمدہ پر پھیلا دے یا ان کے کسی قول کے کسی ضمنی اشارہ کو ٹٹولے اور اس سے مسئلہ کا جواب مستنبط کرے، چنانچہ بعض اوقات ایک کلام اپنے اندر ایسا اشارہ یا اقتضاء رکھتا ہے جس سے مسئلہ زیر غور کی گرہ کھل جاتی ہے، اور کبھی مسئلہ مصرحہ (جس کی تصریح اپنے شیوخ کے اقوال میں ہوتی ہے) کی ایک نظیر ہوتی ہے، اس لیے اس کو اس پر محمول کر دیا جاتا ہے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی، (جو اقوال شیوخ میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہوتا بلکہ) جس کی تصریح تخریج یا سبر[1] یا حذف سے ہو چکی ہوتی ہے، علت کا سراغ لگاتے ہیں اور (اشتراک علت کو دیکھتے ہوئے) اُس مسئلہ پر بھی وہی حکم لگا دیتے ہیں جس کی تصریح (ابھی تک کے مجموعۂ اقوال و فتاویٰ میں)

[1] "سبر" تخریج کی طرح ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل کے تمام اوصاف کو اس فرع کے سامنے جس کو اصل پر قیاس کیا جا رہا ہے، رکھ کر دیکھا جائے اور اس وصف کو لے کر جو اصل اور فرع میں مشترک طور پر موجود ہے، باقی سے صرفِ نظر کر لیا جائے تاکہ حکم کی علت متعین ہو جائے۔ (مترجم)

موجود نہیں ہوتی۔ بعض اوقات اس مسئلہ مصرحہ کے متعلق اس طرح کی دو تقریریں ہوتی ہیں کہ اگر دونوں قیاس[۱] افتراقی یا قیاس شرطی[۲] کے طور پر ایک مرکز پہ جمع ہوجائیں تو اس سے جو نتیجہ برآمد ہو، وہی اس مسئلہ کا جواب ہوجائے۔ پھر کبھی صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک بات شیوخ کے فرمودات میں، مثال اور تصنیفی تقسیم کے اعتبار سے تو بالکل بے نقاب ہوتی ہے مگر بلحاظ تعریف ــــ ایسی تعریف جو جامع بھی ہو اور مانع بھی ــــ وہ نامعلوم اور غیر متعین ہوتی ہے، تو اس شکل میں وہ اہل زبان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور پوری کاوش سے اس امر کی ذاتیات[۳] معلوم کرتے ہیں، اس کی جامع اور مانع تعریف معین کرتے ہیں، اس کے مبہم حصوں کو واضح طور پر متعین اور اس کے مشابہ پہلوؤں کو ممیز کرتے ہیں۔ کبھی شیوخ کا کوئی قول دو صورتوں کا احتمال رکھتا ہے تو یہ اہل تخریج غور کرکے ایک صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ کبھی مسائل اور ان کے دلائل میں جو تعلق ہوتا ہے، اس پر پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے تو یہ لوگ اپنی انگشت بحث و فکر سے اس پردہ کو ہٹا دیتے ہیں۔ بعض اہل تخریج نے اپنے ائمہ کے (اقوال و تصریحات کے بجائے ان کے) کسی کام کے کرنے، یا کسی کام پر سکوت اختیار کرنے سے بھی استدلال کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مجتہد فی المذہب غرض یہ ہیں استنباط مسائل کے وہ طریقے جن کو تخریج کہا جاتا ہے، اور جو مسئلہ اس طرح مستنبط کیا جاتا ہے اس کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ "فلاں شخص کا تخریج کیا ہوا مسئلہ یہ ہے"، یا اس طرح کہ "فلاں امام کے مذہب پر، یا فلاں کی قائم کردہ بنیاد کے لحاظ سے، یا فلاں کے قول کے مطابق مسئلہ کا جواب یہ ہے"، اور وہ لوگ (جو یہ تخریج کرتے ہیں) مجتہد فی المذہب کہے جاتے ہیں۔ اور یہ جو کسی نے کہا ہے کہ "جس نے مبسوط یاد کرلی وہ مجتہد ہے" ــــ یعنی اگرچہ وہ علم روایت سے بالکل بے بہرہ ہی کیوں نہ ہو اور ایک حدیث بھی نہ جانتا ہو ــــ تو اس قول سے اس کی مراد دراصل اس اجتہاد سے ہے جس کی بنیاد اسی

---

[۱] قیاس اقترانی "علم منطق کی اصطلاح میں اس قیاس کو کہتے ہیں جس کے مقدمات کے بیان کے بعد ان مقدمات کا نفس نتیجہ یا اس کا نقیض مذکور ہو۔ [۲] "قیاس شرطی" قیاس اقترانی ہی کی ایک مخصوص قسم ہے، جس کے دونوں مقدمے شرطی ہوں۔ مقدمہ شرطی سے مراد وہ مقدمہ ہے جس میں کسی چیز کے لیے کسی دوسری چیز کے ثبوت یا اس کی نفی کا حکم نہ لگایا گیا ہو۔

[۳] "ذاتیات" سے مراد کسی امر کے وہ اوصاف ہیں جو اس کی حقیقت اور جوہریت سے تعلق رکھتے ہوں۔ (مترجم)

قاعدۂ تخریج پر ہو۔

بعض مذاہب کے پھیلنے اور بعض کے مٹنے کے اسباب

یہ تخریج ہر مذہب میں ہوئی اور پورے زور شور سے ہوئی۔ لیکن پھر ہوا یہ کہ جس مذہب کے اہل علم شہرت عام کے مالک تھے، قدرتاً قضا اور افتا کے مناصب انہی کو سپرد کر دیے گئے، جس کی وجہ سے ان کی تصنیفات عوام الناس میں مشہور ہو گئیں اور ہر طرف لوگ ان کو پڑھنے پڑھانے لگے۔ اس طرح وہ مذہب اطراف عالم میں پھیل نکلا اور برابر پھیلتا رہا۔ اس کے برعکس جس مذہب کے علمبردار گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے، اور نہ ان کے ہاتھوں میں قضا و افتا کے عہدے آئے، نہ عام لوگوں نے ان سے کسی گہری وابستگی کا اظہار کیا، وہ مذہب چند ہی دنوں بعد صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گیا۔

مسلک حق و راہ اعتدال

جاننا چاہیے کہ مذکورہ بالا دونوں طریق استنباط — طریق تخریج اور طریق تتبع احادیث — میں سے ہر طریقہ اپنے لیے ایک مضبوط دینی بنیاد رکھتا ہے۔ اور علمائے محققین ہر زمانہ میں بیک وقت ان دونوں طریقوں کو اختیار کرتے رہے ہیں (فرق صرف تناسب میں ہوتا تھا یعنی) بعض نے طریق تخریج سے زیادہ کام لیا اور الفاظ حدیث کے اتباع کا کم لحاظ کیا، اور بعض کا رجحان اتباع روایات کی طرف زیادہ اور طریق تخریج کی طرف کم رہا۔ پس یہ مناسب نہیں ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک طریقہ کو بالکلیہ چھوڑ دیا جائے، جیسا کہ (بدقسمتی سے اہل الحدیث اور اہل فقہ) دونوں جماعتوں کے عام لوگوں کا شیوہ ہے۔ حق خالص یہ ہے کہ (ان دونوں طریقوں کو جمع کیا جائے) ان میں باہم مطابقت پیدا کی جائے اور ایک کے اندر جو نقص ہے، دوسرے کی مدد سے اس کی تلافی کی جائے۔ یہی مدعا ہے حضرت حسن بصری کے اس ارشاد کا کہ:

> "اس خدا کی قسم، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تمہارا راستہ غالی (حد سے تجاوز کرنے والے) اور جافی (حد واجب تک پہنچنے میں کوتاہی کرنے والے) دونوں کے درمیان ہونا چاہیے"۔

پس، جو اہل حدیث ہیں، ان کو چاہیے کہ اپنے اختیار کیے ہوئے مسائل اور مذاہب کو عہد تابعین اور اس کے بعد کے ائمہ مجتہدین کی رایوں پر پیش کریں، اور جو اہل تخریج ہیں ان کو احادیث کے ذخیرہ سے فکر و نظر کا وہ لگاؤ پیدا کرنا چاہیے جس کے ذریعہ وہ کسی صریح اور ثابت شدہ (حدیث) کی مخالفت سے بچ سکیں،

اور کسی ایسے مسئلہ میں جس کے متعلق کوئی حدیث یا اثر موجود ہو، اپنی رائے لگانے سے حتی الوسع احتراز کر سکیں۔

اہل الحدیث کی افراط کسی محدث کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ ان اصول و قواعد کے استعمال میں، جن کو ائمہ حدیث نے پورے اطمینان کے ساتھ وضع کیا ہے لیکن بہرحال ان کی قطعیت پر شارع کی کوئی نص موجود نہیں ہے، اتنا غلو اور تشدد کرے کہ اس سے کسی حدیث کو (جو ان قواعد پر پوری نہ اترتی ہو) یا کسی قیاس صحیح کو ٹھکرا بیٹھے۔ مثلاً ہر اس حدیث کا انکار کر دینا جس کے مرسل یا منقطع ہونے کا معمولی شبہہ بھی موجود ہو، جس طرح کہ علامہ ابن حزم نے کیا ہے کہ امام بخاری کی روایت کی ہوئی "تحریم معازف" (گانے بجانے کو حرام قرار دینے) والی حدیث کو صرف اس بنا پر رد کر دیا کہ اس کی سند میں انقطاع کا شبہہ موجود ہے، حالانکہ یہ حدیث فی الواقع متصل اور صحیح ہے (اس لیے ایک ایسے شبہہ کو جس کی واقعیت پر کوئی ثبوت موجود نہیں، اتنی اہمیت دینا کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا کہ حدیث کو بالکل ناقابل قبول ٹھیرا دیا جائے) اس قسم کے شکوک کو صرف اسی وقت درخور اعتنا سمجھا جانا چاہیے جب کہ کوئی دوسری صحیح حدیث اس کے مخالف پڑتی ہو۔

یا مثلاً محدثین کا یہ کہنا کہ "فلاں راوی فلاں شخص کی روایات کا سب سے بڑا حافظ ہے" (اس بات کا ان کے طرز فکر و عمل پر اتنا گہرا اثر ہوتا ہے کہ وہ اس راوی کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو دوسروں کی بیان کردہ حدیثوں پر لازماً ترجیح دے دیا کرتے ہیں، اگرچہ دوسرے راویوں میں (دیگر اعتبارات سے) ترجیح کے ہزاروں وجوہ پائے جاتے ہوں اور جب کہ (یہ بات بھی معلوم و مسلم ہے کہ) روایت[1] بالمعنی کرتے وقت عام راویان حدیث کی نگاہیں معانی پر مرکوز رہا کرتی تھیں نہ کہ ادب و زبان کے ان نکتوں پر، جو صرف بال کی کھال نکالنے والے عربی دانوں کے جاننے پہچاننے کی چیزیں ہیں تو "ف" "یا" "و" وغیرہ حروف سے، یا کسی لفظ کی تقدیم و تاخیر سے استدلال کا رخ متعین کرنا، اور اسی طرح کی اور باتیں ان کے تکلف بے جا اور تشدد ناروا کی آئینہ دار ہیں (جن کو اصل مقصد روایت سے کوئی تعلق نہیں) ورنہ تم دیکھتے ہو کہ عموماً جب کوئی دوسرا راوی

[1] "روایت بالمعنی" کا مطلب یہ ہے کہ ارشادات رسول کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کے اصل مقصود کو اپنے لفظوں میں ادا کر دیا جائے۔ اکثر و بیشتر راویوں کا طریقۂ روایت یہی تھا۔ (مترجم)

اسی روایت کو بیان کرتا ہے تو اس حرف کو چھوڑ کر (جس کو راوی اول نے استعمال کیا تھا) اس کی جگہ کوئی دوسرا حرف لاتا ہے۔ پس اس باب میں قول فیصل یہ ہے کہ راوی جو کچھ بیان کرتا ہے، اس کے متعلق بظاہر یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ رسول اکرم صلعم کا ارشاد ہے۔ ہاں اگر کوئی دوسری حدیث یا کوئی اور دلیل (اس کے خلاف) منظر عام پر آجائے تو ضروری ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی طرح رجوع کر لیا جائے۔

اہل الرائے کی تفریط اسی طرح اہل تخریج کے لیے بھی یہ مناسب نہیں کہ کرید کرید کر کسی ایسے قول کی تخریج کریں جو ان کے ائمہ اور شیوخ کے کلام کی روح اور مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو اور اہل زبان و علمائے لغت کا عام اسلوب سخن فہمی اِس قول کو اس کلام کا نتیجہ قرار دینے سے انکار کر رہا ہو، اور اس قول کی بنیاد (اصل اور فرع کی) جس علت مشترک کی تخریج پر رکھی گئی ہو، یا اس کو جس مسئلہ کی نظیر مان کر اس پر محمول کیا گیا ہو (وہ متفق علیہ نہ ہوں بلکہ ان کے علت مشترک ہونے یا نظیر مسئلہ ہونے میں) ارباب نظر اختلاف رکھتے ہوں اور ان کے بارے میں ایک سے زائد رائیں پائی جاتی ہوں، پھر (اس تخریج کی صحت کے غیر یقینی ہونے کی حد یہ ہو کہ) اگر بالفرض خود ان ائمہ مذہب سے (جن کے اقوال کو سامنے رکھ کر یہ تخریج کی گئی ہے) یہی مسئلہ پوچھا جاتا تو شاید وہ بھی کسی امر مانع کی وجہ سے اس معاملہ کو اس مسئلہ کی نظیر قرار دے کر اس پر محمول نہ کرتے، یا اپنے قول کی کوئی ایسی علت بتاتے جو ان حضرات کی معین کی ہوئی اور نکالی ہوئی علت کے ماسوا ہوتی۔ تخریج تو جائز صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ در اصل مجتہد کی تقلید کا دوسرا نام ہے، اس لیے وہ نقص سے پاک اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ کلام مجتہد کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کی گئی ہو۔

اسی طرح ان لوگوں کے لیے یہ بات بھی اچھی نہیں کہ صرف ایک ایسے اصول کی پیروی میں (جو اپنی قطعیت پر کوئی نص نہیں رکھتا اور) جس کو خود انھوں نے، یا ان کے شیوخ نے اپنی فہم سے مقرر کر رکھا ہے۔ کسی ایسی حدیث یا اثر کو رد کر دیں جس کو تمام علمائے حدیث صحیح کہتے اور مانتے آئے ہوں۔ جیسا کہ بعض حضرات نے (اپنے قیاس اور اپنے اصول کی پیروی میں) حدیث "مصراۃ"[1] کو ٹھکرا دیا، یا جس طرح اموال غنیمت

---

[1] "مصراۃ" اس دودھ والے جانور کو کہتے ہیں جس کو بیچنا مقصود ہو اور اس کے تھن سے چند اوقات اس لیے دودھ نہ نکالا گیا ہو کہ خریدار اس کے تھن کی بڑائی دیکھ کر دھوکے میں پڑ جائے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۰ پر)

میں قرابت داران رسول[ط] کے حصہ کو ساقط کر دیا۔ یہ اس لیے کہ ایک خود ساختہ اصول کے مقابلہ میں حدیث رسول کا پاس بہرصورت زیادہ ضروری ہے۔ یہی وہ راز حقیقت ہے جس کی طرف امام شافعی کے یہ الفاظ اشارہ کر رہے ہیں

"میں نے جو رائے بھی دی ہو یا جو اصول بھی مقرر کیا ہو (حدیث رسول کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں) اگر رسول اللہ صلعم کا کوئی ارشاد اس کے خلاف مل جائے تو لینے کے قابل وہی بات ہے جو رسول کی طرف سے ملی ہو"

(اہل الحدیث اور اہل تخریج کی افراط و تفریط کے بارے میں) ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، قریب قریب بالکل وہی حقیقت ان الفاظ سے بھی ٹپک رہی ہے جو امام ابو سلیمان خطابی نے اپنی کتاب "معالم السنن" کے آغاز بحث میں تحریر کیے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں ارباب علم دو گروہ ہو گئے اور دو پارٹیوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک گروہ تو اہل حدیث و آثار حضرات کا ہے اور دوسرا اہل فقہ و نظر کا۔ ان کا حال یہ ہے کہ (دو مخالف کیمپ ہونے کے باوجود) یہ دونوں ایک دوسرے کے برابر کے محتاج ہیں اور اپنا مقصود واقعی حاصل کرنے میں ان دونوں میں سے کوئی بھی اپنے مد مقابل گروہ سے بے نیاز نہیں، کیونکہ حدیث کی حیثیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۳) حدیث مصراۃ کا مفہوم یہ ہے کہ "جو شخص ایسا جانور خریدے، اس کو دوہنے اور حقیقت حال سے واقفیت ہو جانے کے بعد اسے اختیار ہے کہ چاہے جانور کو رکھے یا واپس کر دے۔ اگر واپس کرے تو نکالے ہوئے دودھ کے عوض اس کے مالک کو ایک صاع خرما دیدے"

بعض فقہا نے اس حدیث پر عمل کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ وہ کوئی عام قانون نہیں بن سکتی یعنی وہ خلاف قیاس ہے، قیاس تو کہتا ہے کہ نکالے ہوئے دودھ کا ضمان (بدل) اسی کے برابر ہونا چاہیے لیکن اس حدیث کا کہنا یہ ہے کہ چاہے دودھ کتنا ہی نکالا ہو، ایک سیر نکالا ہو یا دس بیس سیر بہرحال اس کا ضمان ایک ہی صاع خرما ادا کرنا چاہیے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا[ط]) "قرابت داران رسول" سے مراد بنی ہاشم اور بنی مطلب ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو فتح خیبر کے بعد کل مال غنیمت کا پچیسواں حصہ دیا تھا۔ لیکن خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس پر عمل نہ ہونے کے باعث بعض فقہا نے ان لوگوں کے اس حصہ کو تسلیم نہیں کیا۔

(مترجم)

بنیاد کی سی ہے جس کو اصل کہنا چاہیے، اور فقہ کی حیثیت عمارت کی سی ہے، جو اصل کے لیے فرع کا مقام رکھتی ہے، اور سبھی (جانتے ہیں کہ) جو عمارت کسی بنیاد کے اوپر نہ اٹھائی گئی ہو وہ کبھی ٹھیر نہیں سکتی اسی طرح ہر وہ بنیاد، جس کے اوپر کوئی عمارت نہ ہو، ایک چٹیل میدان اور اجڑے ہوئے کھنڈر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگرچہ ان دونوں فرقوں میں، اپنے مقام و محل کے اعتبار سے، چولی دامن کا ساتھ ہے، اور ہر ایک دوسرے کی (اعانت کی) عمومی احتیاج رکھتا ہے، اور کسی لمحہ بھی کوئی گروہ دوسرے کی محتاجی سے مستغنی نہیں ہو سکتا، مگر (ان تمام باتوں کے باوجود) میں ان کو (ایسا غلط کار) پاتا ہوں کہ وہ باہم کھنچے ہوئے ہیں، حالانکہ راہ حق میں تعاون ان پر لازم ہے لیکن وہ ایک دوسرے کی پشت پناہی نہیں کرتے۔ ان میں سے جو طبقہ "اہل حدیث" کہلاتا ہے اس کے سواد اعظم کی معراج سعی و عمل صرف یہ ہے کہ روایتوں کو بیان کرے، سندوں کو جمع کرے اور ان غریب و شاذ حدیثوں کو جن کی عبارتوں کا بڑا حصہ موضوع یا مقلوب[1] ہے، تلاش کرتا رہے۔ یہ لوگ (سند کے ایسے پجاری ہوتے ہیں کہ) نہ تو متن احادیث کا کوئی لحاظ کرتے، نہ اپنی نگاہ کو مدعائے حدیث سے آشنا کرتے، نہ اس کے اسرار کا سراغ لگاتے، نہ ان کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈھ نکالنے کی سعی کرتے۔ بسا اوقات فقہا پر عیب لگانے اور انھیں مطعون کرنے اور ان پر سنت رسول کی مخالفت کا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے، حالانکہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ فقہا کو علم و فہم شریعت کی جو دولت بخشی گئی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ان لوگوں کے حصہ میں آئی ہے، اور ان کے خلاف اس قسم کے برے کلمات نکال کر وہ (مفت میں) گناہ گار ہوتے ہیں۔

رہا دوسرا طبقہ، یعنی اہل فقہ و نظر حضرات کا طبقہ، تو اس کا حال یہ ہے کہ اس کے اکثر افراد حدیث کے ساتھ کچھ یونہی سا لگاؤ رکھتے ہیں، نہ تو صحیح حدیثوں کو ضعیف حدیثوں سے علیحدہ کر پاتے ہیں، نہ کھری اور کھوٹی روایتوں کو پہچان کر دیتے ہیں۔ (احادیث سے ان کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ) اگر ان لوگوں کو اپنے اختیار کردہ مذہب اور اپنی محبوب رایوں کے موافق (بھی) کوئی حدیث مل جائے تو

[1] "مقلوب" اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے الفاظ یا جملوں میں راوی نے اپنی غلطی سے تقدیم و تاخیر کر دی ہو۔ (مترجم

وہ اس سے اپنے مخالفوں کے خلاف حجت قائم کرنے کی کوئی پروا نہیں رکھتے۔ حدیث کے رد و قبول کے بارے میں ان لوگوں نے باہم یہ طے کر رکھا ہے کہ ضعیف اور منقطع روایتیں (بھی) —— اگر وہ اپنے ائمہ اور شیوخ کے درمیان مشہور و مقبول رہی ہوں تو —— قبول کرلی جائیں، خواہ ان کی بنیاد کتنی ہی ناپائیدار اور ان کی صحت کتنی ہی موہوم کیوں نہ ہو۔ یہ "رای" کی ایک (کھلی ہوئی) لغزش اور نارسائی ہے۔

پھر (ان لوگوں کی ایک عجیب وغریب ستم ظریفی یہ ہے کہ) اگر ان کے سامنے، ان کے مذہب کے کسی بڑے شخص، اور ان کے اسکول کے کسی ممتاز لیڈر کا اجتہاد کیا ہوا کوئی قول بیان کیا جاتا ہے تو اس کو قبول کرلینے کے لیے تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس قول کے راویوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد راوی کون ہے (بس اسی کی روایت کو لیتے ہیں) غرض اس قول کے قول امام ہونے کی بابت تو تحقیق کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ مالکیوں کو تم پاؤ گے کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں صرف انہی اقوال کو معتبر مانتے ہیں جو ابن قاسم، اشہب اور انہی کے ہم پایہ دوسرے مالکی علمائے عظام کے روایت کردہ ہوں، اور اگر عبداللہ ابن عبدالحکیم جیسے (نسبۃً کم درجے کے) علما کے ذریعہ، (ان بڑے علمار کی روایتوں کی مخالفت) کوئی روایت بہم پہنچی ہو تو اس کو کوئی حیثیت نہیں دی جاتی۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ کے پیرو، امام موصوف کے صرف انہی اقوال کو قبول کرتے ہیں جو امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن اور ان ہی کے مانند امام اعظم کے دیگر بلند مرتبہ تلامذہ کے نقل کیے ہوئے ہوں۔ اُن اقوال کی روایت کو قبول و اعتبار کا شرف استحقاق کبھی نہیں بخشتے جو حسن بن زیاد لولوی اور ان سے کم درجہ کے لوگوں کے واسطے سے ملے ہوں اور مذکورہ بالا نامور علماے احناف کی روایتوں کے خلاف پڑتے ہوں۔ شوافع کا بھی یہی حال ہے، یہ لوگ اقوال شافعی میں سے صرف انہی اقوال کو تسلیم کرتے ہیں جو مُزنی اور ربیع ابن سلیمان مرادی کے روایت کیے ہوئے ہوں، اور اگر حرملہ اور بُجَیری وغیرہ (جیسے فروتر مرتبے کے شافعی علمار) نے امام ممدوح کا کوئی قول (ان اقوال کے خلاف) نقل کیا ہو تو اس کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے، حتی کہ اس کو اقوال شافعی میں شمار کرنے

کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ الغرض اپنے ائمہ اور اساتذہ کے احکام مذاہب (کے قبول و عدم قبول) میں ہر فرقہ کے اہل علم کا یہی دستور ہے۔ پس اگر ان جزئیات میں، اور ان ائمہ کے اقوال کی روایتوں میں، ان "اصحاب فقہ و نظر" (کی تحقیق و احتیاط) کا یہ عالم ہے کہ ان کو قبول کرنے کے لیے ان کی صحت کا پختہ اور قابل اعتماد ہونا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لیے یہ کس طرح جائز ہے کہ وہ صرف اس سے اہم تر بلکہ سب سے اہم ترین معاملہ میں سہل انگاری سے کام لیں اور اُس امام کے ارشادات کے نقل و بیان میں (روایات کی قوت اور ضعف، اور راویوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت کا لحاظ کیے بغیر کچھ لوگوں کے ذاتی رجحانات پر) تکیہ کر لیں، جو تمام اماموں کا امام اور اللہ رب العزت کا نمائندہ ہے، جس کی تعمیل ارشاد ہمارے لیے فرض، اور جس کی طاعت گزاری ہر ایک استثنا سے بالا تر ہے، جس کے فرمان کے آگے سر تسلیم جھکا دینا اور جس کے حکم کو بجا لانا ہمارے لیے ضروری ہے، ایسا ضروری کہ اس کے فیصلوں کے خلاف ہمارے لیے اپنے دلوں میں کوئی تنگی، اور اس کے فرامین کی طرف سے اپنے سینوں میں کوئی جذبۂ عناد محسوس کرنا موجب ہلاکت ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ اگر ایک آدمی اس بات کا مجاز ہے کہ وہ اپنے نجی معاملہ میں غفلت اور بے پروائی سے کام لے اور اپنے قرض خواہوں سے معاملہ کرنے میں اپنے حق کو مسامحت کی نذر کر دے، مثلاً ان سے لے تو کھوٹی چیز، مگر ادا اسے قرض میں دے انھیں کھری چیز، تو کیا اس کو کسی دوسرے کے حق کے بارے میں بھی اس طرز عمل کا مجاز گردانا جا سکتا ہے، جب کہ وہ صرف اس کا نائب بنایا گیا ہو؟ مثلاً کسی ضعیف کا ولی ہو، یا کسی یتیم کا وصی، یا کسی شخص نامؤجود کا وکیل۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ اس وقت ایسا کرے گا تو اس کا یہ فعل صریح خیانت اور عہد شکنی قرار پائے گا۔ لیکن بعینہٖ یہی طرز عمل ہے جو حدیث کے بارے میں اختیار کیا گیا، بچشم سر یا بچشم دل جس طرح بھی تم چاہو، اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ سکتے ہو۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کچھ گروہوں نے اس جادۂ حق کے طے کرنے میں دقت محسوس کی اور دیکھا کہ اس طور پر (احکام شریعت کے علم سے) بہرہ مند ہونے کے لیے ایک لمبی مدت درکار ہے، درانحالیکہ وہ چاہتے یہ تھے کہ منزل مقصود پہ جلد جا پہنچیں، اس لیے انھوں نے تحصیل علم کے طریقہ کو مختصر کر لیا، اور چند محدود باتوں اور اصول فقہ کے معانی

سے نکلی ہوئی کچھ مخصوص چیزوں کو اپنے لیے کافی سمجھ لیا، جن کا نام انھوں نے "علم" رکھا اور اس لیے تاکہ ہم بھی علم کے پانچوں سواروں میں گنے جائیں، ان "حقائق عالیہ" کو اپنی دستار فضیلت کا طرۂ امتیاز بنایا۔ اب وہ ان کے لیے ایک ڈھال ہیں جس کو اپنے مخالفین کے ساتھ ہم نبرد ہونے کے وقت وہ استعمال کرتے ہیں، ایک ٹٹی ہیں جس کی آڑ میں موشگافیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا طوفان اٹھاتے ہیں۔ انہی کے ذریعہ مناظرے کے میدان گرم کرتے ہیں اور ان ہی کے اوپر باہم ہاتھا پائی ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب میدان مناظرہ سے باہر تشریف لائی جاتی ہے تو اس شخص کے سر پر دانائی اور بزرگی کا سہرا باندھ دیا جاتا ہے جو اس معرکہ میں بازی لے گیا ہو۔ اب وہی اپنے وقت کا نامور فقیہ ہے اور وہی اپنے مقام کا عالی مرتبہ امام۔

یہ تو رہا ایک طرف، پھر (اس پر مزید یہ کہ) شیطان نے چپکے سے ان کے دلوں میں ایک لطیف حیلہ ڈال دیا اور ان کو ایک کاری فریب میں لا پھنسایا یعنی انھیں یہ پٹی پڑھائی کہ یہ جو تمھارے پاس علم کا سرمایہ ہے وہ بہت ہی کم اور حقیر ہے جس سے تمھاری ضرورت پوری نہیں ہو سکتی اور نہ وہ تمھارے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ اس لیے علم کلام سے اس کو تقویت دو اور ادھر ادھر کے کچھ کلامی مباحث کا اس میں پیوند لگاؤ اور متکلمین کے پر پیچ اصولوں کو اس کا پشت پناہ بناؤ، تاکہ تمھارے سامنے غور کی شاہراہ باز، اور فکر کا میدان وسیع ہو سکے۔ (افسوس کہ) شیطان کا خیال پورا ہو کر رہا اور مسلمانوں کے ایک مختصر گروہ کو چھوڑ کر باقی سب نے اس کی اطاعت اور پیروی اختیار کر لی۔ حیرت ہے ان لوگوں پر اور ان کی عقلوں پر! (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ) شیطان لعین انھیں کہاں لیے جا رہا ہے؟ اور ان کے اصل مقصود اور مرکز ہدایت سے ہٹا کر انھیں کس کھڈ میں ڈال گیا ہے؟ اللہ ہماری مدد کرے۔"

(باقی)